"حیات طیبہ" تقویٰ، طہارت اور توبہ کے سائے میں

"The Pure Life" in the shadow of Piety, Cleanliness and Repentance

Open Access Journal
Qtly. Noor-e-Marfat
eISSN: 2710-3463
pISSN: 2221-1659
www.nooremarfat.com
Note: All Copy Rights are Preserved.

Dr. Muhammad Furqan Gohar
History of Islamic Civilization; Mustafa International University, Qum, Iran.
E-mail: m.furqan512@yahoo.com

Abstract: This research answers the question about the basic perfections necessary for the ensurance of a "Pure Life" [*Hayat-e Tayyaba*] at the social level. The assumption is that, piety, purity and repentance are 3 attributes Allah almighty has entrusted in the Holy Qur'an, to ensure the "Pure Life". The research methodology adopted here is the interpretation of Quran by Quran; i.e "*Tafseer-ul Qur'an bil Qur'an*".

In regord with "Piety", it has been proved in the light of holy verses that the "Pious" people [*Mu'taqin*] are the group of visionaries who create good life in the society on the basis of mutual cooperation, patience and persistence, reform of economic affairs and stable oral communication. They are the bearers of piety and Clean.

The puritans not only strive to avoid physical and external pollution, but also strictly avoid the purity of faith and hypocritical behavior. The Repentance [*Tawabiyat*] plays a complementary role to the previous two attributes. Rather than insisting on their mistakes, puritanical and conscientious people are always concerned with reforming and improving.

Thus, in the intellectual system of the Qur'an, the three traits of piety, purity and repentance together provide the moral basis for leading the Muslim society towards a good life.

Key words: Muslim Society, Pure, Life, Piety, Cleanliness, Repentance..

خلاصہ

پیش نظر تحقیق اس مسئلے کی وضاحت کرتی ہے کہ اجتماعی سطح پر حیات طیبہ کے تحقق کے لیے کن بنیادی کمالات کا ہونا ضروری ہے۔ فرضیہ یہ ہے کہ قرآن کریم میں اللہ تعالی نے اپنی محبت کے اظہار میں جن تین اوصاف کو کردار سازی کی ذمہ داری سونپی ہے وہ تقوا، طہارت اور توابیت ہیں۔ یہ تحقیق " تفسیر قرآن بالقرآن" کے اسلوب کے تحت انجام پائی ہے۔

نتیجہ یہ ہے کہ متقین بابصیرت انسانوں کا وہ مجموعہ ہیں جو باہمی تعاون واشتراک عمل، صبر واستقامت، معاشی امور کی اصلاح اور مستحکم زبانی روابط کی بنیاد پر سماج میں حیات طیبہ تشکیل دیتے ہیں۔ یہی لوگ طہارت اور پاکیزگی کے علمبردار ہوتے ہیں۔

پاکیزگی پسند لوگ، نہ صرف جسمانی اور ظاہری آلودگی سے بچنے کی تگ و دو کرتے ہیں بلکہ ایمان کی پاکیزگی اور منافقانہ رویوں سے بھی سخت پرہیز کرتے ہیں۔ توابیت گذشتہ دو صفات کے لئے تکمیلی کردار ادا کرتی ہے۔ پاکیزگی پسند اور باتقوا افراد اپنی غلطیوں پر اصرار کرنے کے بجائے، ہمیشہ اصلاح اور بہتری کے لئے فکرمند رہتے ہیں۔ یوں قرآن کے فکری نظام میں تقوا، طہارت اور توابیت تینوں خصلتیں مل کر مسلم سماج کو حیات طیبہ پر گامزن کرنے کی اخلاقی بنیاد فراہم کرتی ہیں۔

کلیدی الفاظ: مسلم سماج، حیات، طیبہ، تقوا، پاکیزگی، توابیت۔

مقدمہ

یہ تحقیق قرآنی آیات کی روشنی میں مسلم سماج کے اخلاقی ارتقاء کی جڑیں تلاش کرنے کے سلسلے کی کڑی ہے۔ گذشتہ دو مقالہ جات میں ہم مسلم سماج کے اخلاقی ارتقاء میں اللہ تعالی کی پسند اور ناپسند کی تأثیر اور پھر تہذیبی سطح پر محسنین اور مقسطین کے کردار پر روشنی ڈال چکے ہیں۔ تحقیق کے اس حصے میں ہم ان آیات کا جائزہ لیتے ہیں جہاں اللہ تعالی نے متقین، متطہرین اور توابین سے اپنی خاص محبت کا اظہار فرمایا ہے۔

اللہ تعالی نے انسان کو قرآن کریم کے ذریعہ حیات طیبہ تک پہنچنے کا راستہ دکھلایا ہے۔ حیات طیبہ جہاں انفرادی سطح پر کی جانے والی کاوشوں سے تحقق پاتی ہے، وہیں اجتماعی سطح پر پنپنے والے رویوں کی مرہون منت ہے۔ قرآن کریم میں ایسے متعدد مفاہیم ہیں جن میں انفرادیت کے ساتھ ساتھ اجتماعیت کو بھی مد نظر رکھ کر بات کی گئی ہے۔ ان میں سے ایک اہم ترین مفہوم " تقوا" ہے۔ چنانچہ ہم آیات کی روشنی میں واضح کریں گے کہ تقوا کے اندر اجتماعی سطح پر جو اثرات سامنے آتے ہیں، وہ انفرادی تقوا سے الگ نوعیت کے ہیں۔ یوں اگر کسی معاشرے میں اجتماعی رویئے تقوا پر گامزن نہ ہو سکیں اور زندگی کے اجتماعی معاملات تقوا کی بنیاد پر استوار نہ ہوں تو

معاشرہ تقوائے اجتماعی کے اثرات و برکات سے محروم رہے گا، اگرچہ انفرادی اثرات ایک فرد تک پہنچ رہے ہوں۔ اسی طرح تطہیر نفس جس میں پاکیزگی افکار، پاکیزگی کردار اور پاکیزگی اخلاق کی جہد مسلسل شامل ہے، یہ انسانی زندگی کو حیات طیبہ کی جانب گامزن کرنے میں ایک اہم بنیادی اصول ہے۔ ان تمام میں "وجہ جامع" اللہ تعالی کی پسند و ناپسند ہے۔ قرآن کریم نے "متقین"، "متطہرین" اور "توابین" سے پسندیدگی اور محبت کا اظہار فرمایا ہے۔اس اظہار پسندیدگی کے تربیتی پہلوؤں پر ہم گذشتہ ایک تحریر میں روشنی ڈال چکے ہیں۔[1] ان تینوں صفات کی مشترکہ سنخ (قبیل) کے پیش نظر ایک مشترکہ نتیجہ کی کھوج ہمیں اس نقطے پر پہنچاتی ہے کہ "حیات طیبہ" ہی وہ جامع عنوان ہے جو ہم ان تینوں صفات کے حامل افراد یا معاشرے پر اطلاق کر سکتے ہیں۔اس مدعا کی وضاحت پیش نظر مقالے کا موضوع ہے۔

"متقین" اللہ کی خصوصی سرپرستی میں

"تقوا" خطرات سے محفوظ رہنے کا معنی دیتا ہے، بقول راغب اصفہانی کے: "التَّقْوَى جعل النّفس في وِقَايَةٍ مما يخاف" [2] یعنی انسان اپنے آپ کو ایسی چیز سے بچائے جس سے خوف کھاتا ہے۔ یوں "اللہ کا تقوا" خدا خوفی، اللہ کے احکام کا خیال رکھنے، اللہ کی پروا کرنے، اس کی رضامندی حاصل کرنے اور اس کی ناراضگی سے دور رہنے کا نام ہے۔

اللہ تعالی نے تین بار قرآن کریم میں "مقسطین" یعنی انصاف کرنے والوں سے اظہار محبت فرمایا ہے۔ اور اتنی ہی بار "متقین" کے ساتھ اظہار محبت فرمایا ہے۔ (76:3)، (4،7:9) دلچسپ بات یہ ہے کہ ان تینوں آیات میں "تقوا" کو عہد کی پاسداری کے ساتھ جوڑ دیا گیا ہے۔

اس کے علاوہ ایک آیت میں اللہ تعالی نے متقین کے سر پر خصوصی ہاتھ رکھنے کا تذکرہ بھی کیا ہے۔ فرمایا: "وَ اللّٰهُ وَلِيُّ الْمُتَّقِينَ" (19:45) اللہ متقین کا سرپرست ہے۔اللہ کی سرپرستی کا ایک اثر قرآن نے یہ بتلایا ہے کہ انسان اندھیروں سے نکل کر روشنی کی طرف آ جاتا ہے (آیت الکرسی)۔

یہ اندھیرے جن سے نکالے جانے کا وعدہ دیا گیا، کونسے ہیں؟ اللہ کی سرپرستی میں روشنی کا سفر کس طرح سے قابل فہم ہے؟

قرآنی آیات میں کچھ چیزیں ہیں جنہیں تقوا سے جوڑ دیا گیا ہے۔ جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ اللہ کی متقی لوگوں پر سرپرستی کن دائرہ کار کیا ہے۔

1۔ علم و دانش

فرمایا کہ "وَ اتَّقُوا اللّٰہَ وَیُعَلِّمُکُمُ اللّٰہُ (282:02) "اللہ کا خوف کھاؤ اور اللہ تمہیں تعلیم دے گا۔
علم روشنی ہے۔ جہل و نادانی ظلمت ہے۔ کچھ علوم جو اللہ تعالی انسان کو عطا کرتا ہے وہ تقوا اور خدا خوفی سے جڑے ہوتے ہیں۔ یہ اللہ کی سرپرستی کا ایک نمونہ ہے۔

2۔ بصیرت، آگہی

فرمایا: "إِنْ تَتَّقُوا اللّٰہَ یَجْعَلْ لَکُمْ فُرْقَاناً" (29:08)
اگر تم تقوائے پروردگار اختیار کروگے تو اللہ تعالی تمہیں (فرقان) یعنی فرق کرنے کی صلاحیت عطا کرے گا۔
فرقان، قرآن کریم کی ہی ایک صفت ہے۔ چنانچہ ارشاد باری ہے کہ بابرکت ہے وہ ذات جس نے اپنے "عبد" پر "فرقان" اتارا۔ (1:25) قرآن کیونکہ حق و باطل کے درمیان فرق کے اصول و فروع کو کھول کر بیان کرتا ہے، اس لیے فرقان کہلاتا ہے۔ حیرت انگیز طور پر اللہ تعالی نے فرقان جیسی اہم صفت جو قرآن کے خواص میں سے ہے، متقی انسان کو دینے کا وعدہ کیا ہے۔
امام علی (ع) نے بھی فرمایا "فَالْمُتَّقُونَ ... مَنْطِقُهُمُ الصَّوَابُ" [3] یعنی متقی لوگ درست سوچ کے مالک ہوتے ہیں۔
البتہ آپ یقیناً اس بات سے واقف ہیں کہ یہ اوصاف "ذو مراتب" ہیں۔ یعنی ایسا نہیں ہے کہ سب کے پاس علم و آگہی و بصیرت و ہدایت برابر مقدار میں ہو۔ ہر گز نہیں۔ کیونکہ خود "تقوا" بھی مختلف درجات رکھتا ہے۔

3۔ ہدایت

ہدایت پانے کا مطلب حق کا راستہ تلاش کر لینا اور اللہ تعالی کے پیغام کو دل سے قبول کر لینا ہے۔
فرمایا: یہ قرآن "متقین" کے لئے ہدایت ہے "هُدًى لِلْمُتَّقِينَ"۔(2:2) اگرچہ دیگر آیات کے مطابق تمام انسانوں کی ہدایت کا سامان قرآن میں موجود ہے۔ لیکن عملی طور پر جو لوگ اس سے ہدایت دریافت کر پاتے ہیں وہ "متقین" ہی ہیں۔
قرآن انسان کو "صراط مستقیم" یعنی سیدھے راستے پر چلنے کے قواعد و اصول بتلاتا ہے۔ "متقین" ان قواعد و اصولوں کا فہم کرتے ہیں اور پھر انہیں اپنی زندگی میں لاگو کرتے ہیں، یوں وہ ہدایت یافتہ ہو جاتے ہیں۔

4۔ زندگی میں آسانیاں

فرمایا جو شخص تقوائے الٰہی اختیار کرتا ہے، اللہ اس کے معاملات میں آسانیاں پیدا کر دیتا ہے۔

وَ مَنْ يَتَّقِ اللهَ يَجْعَلْ لَهُ مِنْ أَمْرِهِ يُسْراً (4:65)

اگر انسان یہ چاہتا ہے کہ اس کے معاملات باقاعدہ طور پر اللہ کی سرپرستی میں آ جائیں تو بہترین راہ تقوا اختیار کرنا ہے۔

5۔ مشکلات سے باہر نکلنا

فرمایا: "وَ مَنْ يَتَّقِ اللهَ يَجْعَلْ لَهُ مَخْرَجاً" (2:65)

جو شخص تقوائے الاہی اختیار کرے، اللہ اس کے لئے مشکلات سے نکلنے کا راستہ قرار دیتا ہے۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ تقوا اختیار کرنے والا شخص بند گلی میں داخل نہیں ہوتا۔ اس کے لئے ہمیشہ کوئی نہ کوئی راستہ موجود ہوتا ہے۔ کوئی اچھا دوست، کوئی رشتہ دار، کوئی استاد، کوئی بھی ایسا وسیلہ جو اسے ناامیدی اور مایوسی سے نکال کر مشکلات سے نجات دلاتا ہے۔ ایسا شخص خودکشی، منفی سوچ سے محفوظ رہتا ہے۔ زندگی کے متعلق مثبت ذہنیت تقوا کی دین ہے۔ یہ اللہ کی بہت بڑی نعمت ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ تقوا صرف انفرادی امر ہے؟

قرآنی منطق کے مطابق کیا تقوا کے اثرات صرف انفرادی حد تک محدود ہیں یا اجتماعی سطح پر بھی اس کے اثرات قابل تصور ہیں؟

تقوائے اجتماعی کے اثرات

تقوائے اجتماعی سے مراد سماج کے اجتماعی روابط میں خدا خوفی اور پرہیزگاری کا غالب آ جانا ہے۔ جس کی طرف قرآن نے "تَعَاوَنُواْ عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوَى" کے ذریعے دعوت دی ہے۔ یعنی نیکی اور تقوا کی بنیاد پر ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کرو۔ یہ آیت باہمی روابط کی بنیاد نیکی اور تقوا کو قرار دے رہی ہے۔ اس سے نتیجہ ملتا ہے کہ تقوا انسان کی ذات تک محدود نہیں رہتا، بلکہ اجتماعی روابط کی بنیاد کو بھی بدل سکتا ہے۔

تقوا کی انفرادی اور اجتماعی حیثیت کو مد نظر رکھ کر جب ہم قرآن کریم کا مطالعہ کرتے ہیں تو دو قسم کی آیات سامنے آتی ہیں۔

ایک انفرادی حیثیت کی ہیں، جن کی طرف اشارہ ہو چکا ہے۔ ان میں کہا گیا کہ جو شخص تقوا اختیار کرے گا، اس کے لئے آسانیاں پیدا ہوں گی، اس کو زندگی میں مایوسی نہیں ہو گی، ہمیشہ کوئی نہ کوئی راستہ اس کے لئے کھل جائے گا، اللہ تعالی سیدھا راستہ دکھلادے گا وغیرہ۔

تاہم کچھ آیات اجتماعی نوعیت کے تقوا کے الگ سے اجتماعی اثرات کو بیان کر رہی ہیں۔ جن میں سب سے سرفہرست یہ آیت ہے:

وَلَوْ أَنَّ أَهْلَ الْقُرَى آمَنُواْ وَاتَّقَواْ لَفَتَحْنَا عَلَيْهِم بَرَكَاتٍ مِّنَ السَّمَاءِ وَالأَرْضِ وَلَكِن كَذَّبُواْ فَأَخَذْنَاهُم بِمَا كَانُواْ يَكْسِبُونَ (96:7)

ترجمہ: "اور اگر بستی کے لوگ ایمان لاتے اور تقوائے الٰہی اختیار کرتے تو ہم ان پر آسمان اور زمین سے برکتوں کے دروازے کھول دیتے۔ لیکن انہوں نے جھٹلا دیا تو ہم نے ان کے اعمال کے بدلے انہیں پکڑ لیا۔"

یہ آیت اس بات کی نشاندہی کر رہی ہے کہ تقوا کے اجتماعی اثرات بھی ہیں۔ انفرادی طور پر کسی آیت میں تقوا کے اثرات کا تذکرہ اس انداز میں نہیں ہوا کہ آسمان و زمین سے برکتوں کے دروازے کھل جائیں۔ جبکہ اجتماعی سطح پر اس طرح کا تقوا انسان کے لئے سماجی برکتوں کا سبب بنتا ہے۔

یوں پھر پورا معاشرہ فلاح یافتہ ہو سکتا ہے۔ اب یہ سوال ہے کہ اجتماعی تقوا کی کیفیت کیا ہو گی؟

اس کی نشانیاں اور اثرات کس انداز میں ظاہر ہوں گے؟

1۔ مشارکت اور تعاون

وَتَعَاوَنُواْ عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوَى وَلاَ تَعَاوَنُواْ عَلَى الإِثْمِ وَالْعُدْوَانِ وَاتَّقُواْ اللّهَ (2:5)

ترجمہ: "نیکی اور تقوا پر ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کرو۔ اور گناہ و زیادتی پر ایک دوسرے کے ساتھ تعاون نہ کرو اور اللہ کی پروا کرو۔"

باہمی تعاون کسی بھی اجتماعی زندگی کی بنیاد ہے۔ یہ تو بہر صورت قائم رہتا ہے۔ تاہم قرآن کریم کے مطابق یہ تعاون دو قسم کا ہو سکتا ہے۔ پسندیدہ تعاون وہ ہے جو تقوا اور نیکی کی بنیاد پر تشکیل پائے، جبکہ ناپسندیدہ تعاون وہ ہے جو گناہ اور زیادتی کی بنیاد پر تشکیل پائے۔ جس طرح جرائم پیشہ گروہ آپس میں تعاون کرتے ہیں، کرپٹ مافیاز ایک دوسرے سے مربوط ہوتے ہیں، فاسد مقتدر طبقات ایک دوسرے کے مفادات کا تحفظ کرتے ہیں، یہ سب گناہ اور زیادتی کی بنیاد پر تشکیل پانے والے تعاون ہیں۔ جبکہ دنیا میں صلح کے قیام کی اجتماعی کاوشیں، اسلامی سماج کی وحدت کی کاوشیں، معاشرے میں عدل و انصاف کے قیام کی سماجی تحریکیں منجملہ پسندیدہ تعاون کی قبیل سے ہیں۔

2۔ صبر و استقامت

دشمن کے سامنے صبر اور تقوا کی تلقین قرآن کریم نے فرمائی ہے۔ صبر سے مراد یہاں ظلم سہنا اور برداشت کرنا نہیں ہے، بلکہ ظلم کی چالوں کو سمجھ کر بردباری اور تحمل کے ساتھ اس کے خلاف اقدام کر کے اسے شکست دینا ہے۔ یہاں سماج دشمن عناصر کی بات ہو رہی ہے۔ یعنی جو قومیں اپنے دشمن کو پہچان کر اس کے خلاف مسلسل

پلاننگ کرتی ہیں اور استقامت دکھاتی ہیں وہ بالآخر کامیاب ہو جاتی ہیں۔ فرمایا:

إِن تَمْسَسْكُمْ حَسَنَةٌ تَسُؤْهُمْ وَإِن تُصِبْكُمْ سَيِّئَةٌ يَفْرَحُواْ بِهَا وَإِن تَصْبِرُواْ وَتَتَّقُواْ لاَ يَضُرُّكُمْ كَيْدُهُمْ شَيْئًا إِنَّ اللّهَ بِمَا يَعْمَلُونَ مُحِيطٌ (120:3)

ترجمہ: "اگر تمہیں کوئی کامیابی ملے تو انہیں برا لگتا ہے اور اگر تمہارے اوپر مصیبت آن پڑے تو یہ لوگ خوش ہو جاتے ہیں۔ اور اگر تم صبر کرو اور تقوا اختیار کرو گے تو ان کی مکاریاں تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکیں گی اور اللہ تو ان کے اعمال پر محیط ہے۔"

دوسری آیت میں ارشاد ہوا:

وَلَتَسْمَعُنَّ مِنَ الَّذِينَ أُوتُواْ الْكِتَابَ مِن قَبْلِكُمْ وَمِنَ الَّذِينَ أَشْرَكُواْ أَذًى كَثِيرًا وَإِن تَصْبِرُواْ وَتَتَّقُواْ فَإِنَّ ذَلِكَ مِنْ عَزْمِ الأُمُورِ (186:3)

ترجمہ: "تم اہل کتاب اور مشرکین سے بہت اذیت ناک باتیں سنوگے اور اگر تم نے صبر اور تقوا اختیار کیا تو یہ بہت ہی بلند ہمت کا کام ہے۔"

ایک اور مقام پر ارشاد فرمایا:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُواْ اصْبِرُواْ وَصَابِرُواْ وَرَابِطُواْ وَاتَّقُواْ اللّهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ (200:3)

ترجمہ: "اے ایمان والو صبر کرو اور ایک دوسرے کو صبر کی دعوت دو اور آپس میں جڑے رہو اور اللہ کی پروا کرو تاکہ تم کامیاب رہو۔"

بعض آیات میں خاص جنگی حالات کی جھلک نمایاں ہے، تاہم عمومی طور پر ہم جہاں کہیں بھی سماجی کیفیات میں ایک کشمکش دیکھتے ہیں، وہاں کچھ سماج دشمن عناصر معاشرے کے لئے مشکلات کھڑی کرتے ہیں، کمزور طبقات کا جینا حرام کر دیتے ہیں تو ایسے میں چارہ کار کیا ہے؟ قرآن کریم آپس میں جڑے رہنے اور یکجہتی کے ساتھ صبر و استقامت دکھانے پر کامیابی کا وعدہ دیتا ہے۔

3۔ معاشی امور کی اصلاح

فرمایا: يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُواْ لاَ تَأْكُلُواْ الرِّبَا أَضْعَافًا مُّضَاعَفَةً وَاتَّقُواْ اللّهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ (130:3)

ترجمہ: "اے ایمان والو "کئی گنا سود" مت کھاو، اور اللہ کی پروا کرو تاکہ تم نجات پا سکو۔"

سود خوری معاشی معاملات میں ظلم و زیادتی کا ایک واضح نمونہ ہے۔ چنانچہ قرآن نے اسی کے تناظر میں فرمایا کہ "نہ ظلم کرو اور نہ ہی ظلم برداشت کرو"۔

معاشی معاملات کی اصلاح اور بہبود تقوا کے اہم ترین اجتماعی اثرات میں سے ہے۔ یعنی جس سماج میں اجتماعی روابط تقوا اور نیکی کی بنیاد پر وجود میں آئیں گے وہاں معیشت بھی استحصال اور ظلم کے بجائے عدل و برابری اور حقوق کی درست ادائیگی پر قائم ہو گی۔

سورہ رحمان جس کا بنیادی پیغام ہی تقوا ہے، کیونکہ تکذیب تقوا کا نکتہ مقابل ہے، چنانچہ آگے چل کر اسے بیان کیا جائے گا، اس سورہ میں ارشاد باری ہے کہ

أَلَّا تَطْغَوْا فِي الْمِيزَانِ O وَأَقِيمُوا الْوَزْنَ بِالْقِسْطِ وَلَا تُخْسِرُوا الْمِيزَانَ (8:55،9)

ترجمہ: "تم لوگ ترازو میں طغیان مت کرو، وزن کو عدل کے ساتھ قائم کرو اور تول میں کمی مت کرو۔"

معاملات میں "ناپ تول" بنیادی پیمانہ ہے۔ یعنی چیزوں کا اندازہ ان کے وجود کی سنگینی سے لگایا جاتا ہے۔ گذشتہ زمانوں میں "سبک سنگین" کرنے کے لئے ظاہری وزن پر زیادہ زور دیا جاتا تھا۔ جبکہ آج "انفارمیشن ٹیکنالوجی" کے زمانے میں سافٹ ویئرز کا الگ سے وزن ہے۔

تو چیزیں ممکن ہے بظاہر چھوٹی ہی کیوں نہ ہوں، لیکن ان کی ویلیو بہت زیادہ ہوتی ہے۔ یہی ان کا وزن ہے۔

لہٰذا ناپ تول میں "کمی بیشی" سے پرہیز کا مطلب صرف ترازو پر تولنا نہیں ہے، بلکہ اجتماعی معاملات میں انصاف کے اصول کا پاس رکھنا ہے۔

4۔ مستحکم زبانی روابط

تقوا کی ایک اہم اجتماعی نمود، مضبوط، مہذب، منطقی سوچ پر مشتمل گفتگو اور باہمی تفاہم کا وجود میں آنا ہے۔ زبان، روابط جوڑنے کا اہم عنصر ہے۔ ایک دوسرے سے تعارف کا ذریعہ ہے۔ تفہیم و تفاہم کا آسان اور بہترین وسیلہ ہے۔ تاہم ہر زبان سماج کے اندر پائے جانے والے مخصوص اجتماعی طرز فکر کی عکاس بھی ہے۔ جھگڑالو ماحول درحقیقت خاص زبانی فضا میں پیدا ہوتا ہے۔ اور اسی ماحول کا اثر دوبارہ زبان میں منعکس ہوتا ہے۔ جبکہ علمی و فکر کے میدان میں یہ ماحول یکسر ناکارآمد ہے، اسی لیے قرآن کریم نے تقوائے علمی کی طرف دعوت دی ہے۔ علمی تقوا سے مراد آپ کی گفتگو جو کہ علم و فکر کا ماحصل ہے، اسے مضبوط دلائل اور شواہد و قرائن پر استوار ہو۔ چنانچہ ارشاد ہوا:

فَلْيَتَّقُوا اللَّهَ وَلْيَقُولُوا قَوْلًا سَدِيدًا (9:4) ترجمہ: "انہیں چاہیے کہ اللہ کی پروا کریں اور مستحکم بات کریں۔"

مضبوط اور مستحکم دیوار کو "سد" کہتے ہیں۔ بات بھی تبھی "سدید" بنتی ہے جب اس کے اندر عقلانیت اور منطقی سوچ حکم فرما ہو۔ تقوائے الٰہی کیونکہ انسان کی زبان پر اثر انداز ہوتا ہے، اس کو علم و حکمت مل جاتا ہے تو تقوا پر

مشتمل اجتماعی روابط بھی اسی علم و حکمت کی بنیاد پر تشکیل پاتے ہیں، جس کی وجہ سے گفتگو مؤثر رہتی ہے۔ مکالمہ تہذیب وادب کے دائرے میں آگے بڑھتا ہے۔

4۔ حق و باطل میں فرق

قرآن کریم نے جمع کے صیغہ سے مخاطب کرکے فرمایا کہ اگر تم لوگ تقوااختیار کروگے تو تمہیں "فرقان" عطا ہو گا، یعنی اللہ تعالی تمہیں ایسی بصیرت عطا کرے گا، جس سے تم حق و باطل میں تفریق کر سکو گے۔
"فرقان" جس کا اللہ تعالی نے متقی لوگوں سے وعدہ کیا ہے، انفرادی و اجتماعی دونوں سطح پر اپنا کردار ادا کرتا ہے۔ سماج کے اندر رہنے والے ہر فرد کے لئے حقیقت اور فریبکاری کے درمیان تشخیص کا ایک اہم راستہ اللہ کی عطا کردہ ہدایات سے استفادہ ہے جو بغیر تقوائے الٰہی کے ممکن نہیں ہے، کیونکہ قرآن متقین کے لئے ہدایت کا سامان فراہم کرتا ہے۔ جب کوئی سماج من حیث المجموع "اللہ کی کتاب" کو اپنی فکری پناہ گاہ بنالیتا ہے۔ تواس سماج کے اندر حقیقت پسندی بھی آہی جاتی ہے۔ وہ مفادات کا غلام نہیں رہتا۔ شہوات اور تعصّبات اس کی راہ میں رکاوٹ نہیں بنتے۔ یوں وہ باطل کا راستہ روکنے کے لئے تیار ہو جاتا ہے۔

امام علی (ع) اور ابن ملجم مرادی، تقوااور بے تقوائی کا تقابل

تقوا کیا ہے اور بے تقوائی کسے کہتے ہیں؟ ایک تاریخی مثال کی روشنی میں سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ عبدالرحمٰن بن ملجم مرادی ان لوگوں میں سے تھا جنہیں بعد میں خوارج کہا گیا۔ یہ اپنے آپ کو "فدائی" کہا کرتا تھا۔ اس کے بقول وہ اپنے آپ کو خدا کی راہ میں قربان کر رہا تھا۔ اس لیے اس نے "شاری" کا لقب اپنے لیے چنا۔ یعنی اپنی جان خطرے میں ڈال کر مرضی خدا وند کو خریدا۔ اور یوں پھر مکہ سے حضرت علی(ع) کے قتل کا منصوبہ بنا کر چلا، کوفہ آ کر "قطام" سے شادی رچائی اور پھر چند ہی دن میں حضرت علی(ع) کو شہید کر ڈالا اور خود بھی قصاص کے طور پر مار دیا گیا۔
اب سوال یہ ہے کہ کیا تقوا اسی طرح کی چیز کا نام ہے؟ کیا ہر کام جو خلوص نیت سے انجام دیا جائے، چاہے وہ کتنا ہی گھناونا کیوں نہ ہو وہ تقوا بنے گا؟
کیا اعمال کا مطلق دارومدار نیتوں پر ہے؟ یعنی برے سے برا عمل بھی نیت کے ذریعے ٹھیک ہو سکتا ہے؟
ہم جب قرآن کریم میں تقوا کے اثرات و برکات کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں نظر آتا ہے کہ حکمت، ہدایت اور بصیرت تقوا کے لازمی اثرات میں سے ہیں۔
فرمایا: إِن تَتَّقُواْ اللّهَ يَجْعَل لَّكُمْ فُرْقَاناً (29:8)

ترجمہ: "اگر تم تقوائے پروردگار اختیار کروگے تو اللہ تعالی تمہیں (فرقان) یعنی فرق کرنے کی صلاحیت عطا کرے گا۔"

امام علی (ع) نے بھی فرمایا "فَالْمُتَّقُونَ ... مَنْطِقُهُمُ الصَّوَابُ"[4] یعنی: "متقی لوگ درست سوچ کے مالک ہوتے ہیں۔"

فرمایا: یہ قرآن "متقین" کے لئے ہدایت ہے "هُدًى لِّلْمُتَّقِينَ" (2:2)۔ یعنی عملی طور پر جو لوگ اس سے ہدایت دریافت کر پاتے ہیں وہ "متقین" ہی ہیں۔

قرآن انسان کو "صراط مستقیم" یعنی سیدھے راستے پر چلنے کے قواعد و اصول بتلاتا ہے۔ "متقین" ان قواعد و اصولوں کا فہم کرتے ہیں اور پھر انہیں اپنی زندگی میں لاگو کرتے ہیں، یوں وہ ہدایت یافتہ ہو جاتے ہیں۔

دوسری آیت میں ارشاد ہوا کہ جو لوگ ہماری راہ میں کوشش کرتے ہیں، ہم انہیں اپنے راستوں کی ہدایت ضرور کرتے ہیں۔ یہ بھی فرمایا: جس چیز کی بنیاد تقوا اور رب کی مرضی پر رکھی جائے، کیا وہ بہتر ہے یا جس کی بنیاد جہنم کے دہانے پر رکھی جائے اور وہ اسے کھینچ کر لے جائے؟ یہ تقوا اور بے تقوائی کا تقابل ہے۔ یعنی تقوا انسان کو جہنم کی طرف نہیں لے جاسکتا۔

یہ سب آیات بتلاتی ہیں، کہ جو لوگ اسلامی سماج میں گھناؤنے جرموں کا ارتکاب کرتے ہیں۔ خوارج کی طرح بے گناہ انسانوں کا قتل کرتے ہیں، فتنہ و فساد برپا کرتے ہیں۔ تفرقہ ڈالتے ہیں۔ تعصّبات پھیلاتے ہیں۔ جنگیں کرواتے ہیں۔ یہ کام چاہے وہ جتنے ہی تقدس کے ساتھ انجام دیں۔ ان کی نیتیں چاہے بظاہر جتنی ہی خالصانہ کیوں نہ ہوں، انہیں قرآنی نگاہ سے "تقوا" کا مصداق قرار نہیں دیا جاسکتا۔ کیونکہ اگر متقی ہوتے تو اللہ کے ہاں انہیں قبولیت کا شرف بھی ملتا۔ انہیں ہدایت، بصیرت اور تفریق حق و باطل کی صلاحیت بھی ملتی۔ پس اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اعمال کی درستگی سے قبل خود عمل انجام دینے والے کی درستگی ضروری ہے۔ یعنی عمل کرنے والے کا متقی ہونا ضروری ہے تاکہ وہ واقعی "نیک اعمال" کی توفیق پا سکے۔

متقین کے مد مقابل اوصاف

"متقین" کے مد مقابل کون سی صفات کے حامل لوگ ہیں؟

اشیاء کو ان کی ضد سے پہچانا جاتا ہے۔ ہمیں متقی کی حقیقت کو سمجھنے کے لئے، اس کے مد مقابل اوصاف کا بغور جائزہ لینے کی ضرورت ہے۔

قرآن کریم نے متقین کے مقابل میں چند ایک صفات کا تذکرہ کیا ہے۔ ایک اہم صفت "مکذبین" ہیں۔ یعنی

جھٹلانے والے لوگ۔ یہ ایسے لوگ ہیں جو رسولوں کی دعوت پر ایمان نہیں رکھتے۔ ان کے نزدیک اللہ کے رسول عام سے لوگ ہیں جو بڑے بڑے دعوے کرتے ہیں۔

قرآن میں بطور خاص دو سورتوں میں "مکذبین" اور "متقین" کا تقابل سامنے آیا ہے۔ ایک سورہ طور میں جہاں مکذبین کو عذاب اور ہلاکت کے وعید سنائے، وہیں متقین کو جنت کی نوید دی۔ یہی منظر کشی مرسلات میں بڑی واضح طور پر سامنے آئی، جہاں فرمایا:

وَيْلٌ يَوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِينَ O إِنَّ الْمُتَّقِينَ فِي ظِلَالٍ وَعُيُونٍ O (77:40، 41)

ترجمہ: "ہلاکت ہے قیامت کے دن جھٹلانے والوں کے لئے۔ بیشک متقی لوگ ٹھنڈی چھاؤں اور پانی کے چشموں سے سیراب ہوں گے۔"

متقین کا دوسرا نکتہ مقابل فجار ہے۔ فرمایا: أَمْ نَجْعَلُ الْمُتَّقِينَ كَالْفُجَّارِ (38:28)۔ ترجمہ: "کیا یہ (توقع رکھتے ہیں) کہ ہم متقین کو فاجروں کی طرح قرار دیں گے؟"

فجور بقول راغب اصفہانی کے وسیع شگاف اور بڑی پھوٹ کو کہتے ہیں۔[5] آقا مصطفوی لکھتے ہیں: "و الفجور خروج عن التقوی الی التمایل و الشهوات و الفسق فجور"[6] یعنی انسان تقوا سے باہر جا کر شہوات اور گناہوں کی طرف رجحان دکھائے۔ ان اوصاف کے مالک شخص کو فاجر کہا جاتا ہے۔ فجار اسی لغوی جڑ سے نکلا ہوا جمع کا صیغہ ہے۔ "فجار" وہ لوگ ہیں جن کی زندگی یکسر دنیوی لذتوں میں محصور ہو کر رہ جائے اور آخرت سے غافل ہو جائیں۔

دوسری آیت میں "ظالمین" کو متقین کا نکتہ مقابل قرار دیا ہے۔ إِنَّ الظَّالِمِينَ بَعْضُهُمْ أَوْلِيَاءُ بَعْضٍ وَ اللهُ وَلِيُّ الْمُتَّقِينَ (45:19) ترجمہ: "ظالم لوگ ایک دوسرے کے حامی ہیں، جبکہ متقی لوگوں کو اللہ کی سرپرستی حاصل ہے"۔

اسی کے تناظر میں ہم جب دیکھتے ہیں کہ اللہ تعالی جہاں متقین کے ساتھ اظہار محبت کرتا ہے، وہیں "ظالمین" کے ساتھ بغض اور ناپسندیدگی کا اظہار کرتا ہے۔ یہ صورتحال مزید دلچسپ تب ہوتی ہے جب ہم دیکھتے ہیں کہ دونوں میں مساوات موجود ہے۔ یعنی تین بار "متقین" کے ساتھ محبت کا اظہار فرمایا (76:3)، (7،4:9) اور تین بار ہی "ظالمین کے ساتھ محبت نہ ہونے کا اظہار فرمایا۔ (140،57:3)، (40:42)

قرآن کریم نے تین آیات میں "متقین" کو عہد پورا کرنے کا علمبردار قرار دیا گیا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ لوگوں کے ساتھ بدعہدی اور بے ایمانی بھی تقوا کا نکتہ مقابل ہے۔ انہی آیات کے تناظر میں ہم سمجھ سکتے ہیں کہ اللہ تعالی متقین سے محبت کا اظہار فرماتا ہے اور خائنین یعنی خیانت کرنے والوں سے نفرت اور دشمنی کا اظہار فرماتا ہے۔ إِنَّ اللهَ لَا يُحِبُّ الْخَائِنِينَ (58:8)۔ تو یہ تقوا کا ایک اہم لازمہ اجتماعی امور میں امانتداری اور عہد کا پاس رکھنا ہے۔

مزید یہ کہ سورہ قمر میں "مجرمین" اور "متقین" کے انجام کا تقابل پیش کیا گیا ہے۔ (آیت 47 اور 54)
جرم اور گناہ میں فرق ہوتا ہے۔ متقی گناہگار ہو سکتا ہے، لیکن مجرم نہیں۔ کیونکہ جرم یکسر کٹ جانے کو کہتے ہیں، پھل جب درخت سے جدا ہوتا ہے تو اس پر جرم کا اطلاق ہوتا ہے۔[7]، معروف ایرانی لغت دان آقا مصطفوی نے کہا ہے کہ جب یہ کٹ جانا خلاف مصلحت اور خلاف حق و حقیقت ہو تبھی اسے جرم کہتے ہیں۔[8] اگرچہ گناہ پر بھی جرم کا اطلاق ہوا ہے۔ لیکن "مجرم" قرآن کی نظر میں جہنمی ہے۔ جبکہ گناہگار کے لئے بخشش کا کہا گیا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر گناہ جرم نہیں ہے، ہاں اگر انسان بالکل ہی خداوند عالم سے کٹ کر رہ جائے اور گناہ میں غرق ہو جائے تو وہ مجرم ہے۔
یوں نتیجہ لیا جا سکتا ہے کہ "مجرم" اللہ سے کٹ جانے والا، "فاجر" شہوات اور دنیوی لذات میں غرق، "مکذب" انبیاء کو جھٹلانے والا اور "خائن" عہد کا پاس نہ رکھنے والا سب جزئی طور پر "متقی" کے نکتہ مقابل ہیں، جبکہ "ظالم" ایک صفت عام ہے، جو تقوا کا اصلی تقابل رکھتی ہے۔ یعنی جس طرح مقام محبت میں تقوا اللہ تعالی کو پسند ہے، اسی طرح مقام بغض اور ناپسندیدگی میں ظلم ناپسندیدہ صفت ہے۔ ظلم کے اندر فجور، خیانت، تکذیب اور جرم سب داخل ہیں۔ پس ظلم ان تمام رذائل کی جامع صفت کے طور پر قرآن کریم میں مد نظر قرار پایا ہے۔

پاکیزگی پسند لوگ، اللہ تعالی کے محبوب

تقوا سے جڑی ایک صفت جس سے اللہ تعالی نے قرآن کریم میں دو بار اظہار محبت فرمایا ہے، طہارت اور پاکیزگی ہے۔ (222:2)، (108:9)
تزکیہ نفس اہداف انبیاء میں شامل ہے۔ جسے قرآن کریم نے متعدد بار بیان کیا ہے۔ (کافرین کا ایک اہم عذاب اس دنیا میں یہ ہے کہ اللہ تعالی ان کا تزکیہ نہیں کرتا)۔
سوال یہ ہے کہ پاکیزگی کس چیز سے؟
کیا کوئی نجاست انسان کو چمٹی ہے جس میں پاکیزگی کا ہونا ضروری ہے؟
مسیحیت میں غسل تعمید کا تصور انسان کے اولین گناہ سے جڑا ہے۔ بقول ان کے حضرت آدمؑ نے ایک گناہ کیا، اور اس کے بعد پوری نسل آدم آلودہ ہے، لہٰذا غسل تعمید جو آبائے کلیسا کے ہاتھوں دیا جاتا ہے وہ اس آلودگی سے پاکیزہ ہونے کی نشانی ہے۔ جبکہ اسلام میں ایسا کوئی تصور نہیں ہے۔[9] تو پھر سوال یہ ہے کہ اسلام نے پاکیزگی کا تصور کس انداز میں دیا ہے؟ اسے سمجھنے کی ضرورت ہے۔
سب سے پہلا نکتہ اس حوالے سے یہ ہے کہ قرآن مجید نے طہارت اور پاکیزگی کے مفہوم کو تقوا کے ساتھ جوڑ دیا ہے۔ چنانچہ فرمایا:

لا تَقُمْ فيهِ أَبَداً لَمَسْجِدٌ أُسِّسَ عَلَى التَّقْوى مِنْ أَوَّلِ يَوْمٍ أَحَقُّ أَنْ تَقُومَ فيهِ فيهِ رِجالٌ يُحِبُّونَ أَنْ يَتَطَهَّرُوا وَ اللهُ يُحِبُّ الْمُطَّهِّرينَo (108:9)

ترجمہ: "مسجد ضرار میں بالکل بھی نماز کے لئے کھڑے نہ ہو، جس مسجد کی بنیاد تقوا پر رکھی گئی ہے، وہ اس بات کے زیادہ لائق ہے کہ آپ اس میں قیام کریں، اس میں ایسے لوگ ہیں جو پاکیزہ رہنا پسند کرتے ہیں، اور اللہ تعالی پاکیزگی پسند لوگوں سے محبت کرتا ہے"۔

سیاق و سباق سے بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ یہ آلودگی جس کی قرآن نے بات کی ہے، نفاق اور منافقت کی آلودگی ہے، یعنی ظاہر و باطن میں فرق جس کا ایک اہم مصداق مسجد ضرار کی شکل میں سامنے آیا۔ جبکہ مسجد نبوی یا مسجد قباء (بحسب اختلاف آراء[10]) میں موجود لوگوں میں پاکباز لوگ موجود ہیں۔

تفاسیر میں اسے استنجاء اور پانی سے نجاست دور کرنا مراد لیا گیا ہے، جو کہ انصار کا وتیرہ تھا۔[11] لیکن یہ مسئلہ اتنا اہم نہیں ہے کہ اس مسئلے کو اس مسجد ضرار کے ساتھ تقابل کے طور پر پیش کیا جائے۔ گویا یہ توجیہی بیان ہے اس بات کا کہ کیوں مسجد ضرار کے مقابلے میں اس مسجد کی اہلیت ہے۔ تو فرمایا کہ اس میں پاکیزگی پسند لوگ نماز پڑھنے آتے ہیں۔ لہٰذا مناسبت حکم و موضوع کے تحت یہ مسئلہ اتنا اہم نہیں ہے کہ پیغمبر اسلام کو دستور ملے کہ مسجد کو گرادو، بلکہ انہیں آداب طہارت سکھادینا کافی ہو رہتا۔ کیونکہ پیغمبر اسلام کا تو کام ہی سکھلانا ہے۔ پس معلوم ہوتا ہے کہ جس پاکیزگی کا تذکرہ ہے، وہ اندرونی پاکیزگی ہے۔

اب یہ اختلاف ہے کہ وہ مسجد جس کی بنیاد تقوا پر ہے کون سی ہے؟ مسجد قباء ہے یا مسجد نبوی؟ ابن عباس اور چند دیگر صحابہ نے مسجد قباء مراد لی ہے، جبکہ ابن عمر، ابوسعید خدری وغیرہ سے منسوب اقوال میں مسجد نبوی مراد لی گئی ہے۔[12] امام صادق ع کی حدیث کے مطابق بھی مسجد قباء ہی مراد ہے۔[13] زمخشری و علامہ طباطبائی اسی قول کو ترجیح دیتے ہیں۔[14] جبکہ بعض نے دونوں ہی مراد لی ہیں۔[15]

تاریخی طور پر کچھ روایات میں ہے کہ آپؐ نے انصار سے فرمایا کہ اللہ تعالی نے تمہیں پاکیزگی پسندانہ اوصاف کا مالک بتلایا ہے، تو بتاؤ کہ تم کیسے پاکیزہ ہوتے ہو۔ انہوں نے کہا کہ باقی تو ہمیں معلوم نہیں، بس یہودی ہمارے پڑوس میں رہتے تھے، ہم نے ان سے پانی کا استعمال سیکھ لیا ہے، وہ اپنا پاخانہ پانی سے دھوتے تھے تو ہم بھی یہی کرتے ہیں۔[16]، امام صادق ع سے منسوب بھی اسی سے ملتی جلتی ایک روایت موجود ہے، اگرچہ اس میں یہود کا تذکرہ نہیں ہے۔[17]

یہ روایات اس لحاظ سے معقول نہیں معلوم ہوتیں کہ انصار کے ساتھ، آپ (ص) تقریبا نو سال گزار چکے تھے۔

مسجد ضرار کا واقعہ آخری سالوں کا ہے۔ یعنی جنگ تبوک (9 ہجری) کے بعد پیش آیا ہے۔[18] اس کا مطلب ہے کہ نو سال تک آپ کے علم میں نہیں تھا کہ انصار کیسے استنجاء کرتے ہیں۔ جبکہ یہ تو عمومی طرز کی چیزیں ہیں جو انسان کسی بھی سماج میں رہ کر معلوم کر لیتا ہے۔ پس یہ پوچھنا کہ "فَمَا هَذَا الطُّهُور؟" یہ طہور کیا ہے جو تم کرتے ہو، چہ معنا دارد؟

دوسرے یہ کہ مسجد ضرار بھی تو مدینہ کے رہنے والے لوگوں نے بنائی تھی۔ اور استنجاء وغیرہ جیسے آداب و رسوم عمومی نوعیت کے ہوتے ہیں۔ ایسا تو نہیں ہو سکتا کہ ایک ہی قبیلے کے آدھے لوگ الگ طرح سے استنجاء کریں اور دوسرے آدھے لوگ دوسری طرح سے استنجاء کریں۔

تیسری بات یہ ہے کہ بعض روایات کے مطابق خود پیامبر اسلام کا یہ وتیرہ تھا کہ وہ پانی سے استنجاء کیا کرتے تھے۔ چنانچہ عبداللہ ابن عمر نے کہا کہ جب سے ہم نے یہ طریقہ سیکھا، پاکیزگی بھی آ گئی اور بیماری بھی دور ہو گئی۔[19]

بہر حال، بطور کلی ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ طہارت کے متعدد مراتب ہیں۔ ظاہری طہارت بھی ایک مرتبہ ہے۔ اندرونی طہارت اور پاکیزگی الگ مرتبہ ہے۔ دونوں ہی مقصود و مطلوب ہیں۔ تاہم اس آیت میں جس طہارت پر توجہ مرکوز ہے، وہ ایمان اور نیت کی پاکیزگی ہے۔ منافقت سب سے زیادہ نیت کو آلودہ کرتی ہے، پھر اس کے نتیجہ میں عمل آلودہ ہو جاتا ہے۔

"حیات طیبہ" اور بلندی کردار کا رابطہ

چنانچہ اشارہ ہو چکا ہے کہ پاکیزگی پسند لوگوں سے محبت کا اظہار اللہ تعالی نے دو آیات میں کیا ہے۔ ایک آیت میں معنوی پاکیزگی جس میں ایمان، سچی نیت، خلوص دل، پاکیزہ دلی کو اولین ترجیح حاصل تھی۔ جبکہ دوسری آیت کا سیاق و سباق عمل کی پاکیزگی پر تاکید کرتا ہے۔

اندرونی پاکیزگی دو طرح کی ہے۔ ایک انسان کی فکر، سوچ، خیال اور قلب سے وابستہ ہے۔ یہ قلبی کیفیات پر اثر انداز ہوتی ہے۔

پاکیزگی کی دوسری قسم انسان کے عمل، کردار، اور افعال سے وابستہ ہے۔

قرآن حکیم نے معجزاتی طور پر پاکیزگی کی دونوں قسموں کو دو آیات میں سمو دیا ہے۔ اگرچہ کچھ دیگر آیات میں بھی اشارات موجود ہیں۔ تاہم محبت کا اظہار الگ الگ سطح پر دونوں کے لیے کر دیا ہے۔

قلبی پاکیزگی کا تذکرہ سورہ توبہ میں کیا، جس کا ذکر گذر چکا ہے۔ اس حوالے سے ایک اور آیت سورہ المائدہ میں قابل غور ہے۔ فرمایا: الَّذِينَ قَالُوا آمَنَّا بِأَفْوَاهِهِمْ وَلَمْ تُؤْمِنْ قُلُوبُهُمْ . . . أُولَٰئِكَ الَّذِينَ لَمْ يُرِدِ اللَّهُ أَنْ يُطَهِّرَ قُلُوبَهُمْ

ایسے لوگ جو زبان سے اظہار ایمان کرتے ہیں، جبکہ ان کے دل ایمان نہیں لائے۔ ایسے لوگوں کے دلوں کو پاک کرنے کا ارادہ اللہ تعالی نے نہیں کیا۔

یہ وہی قلبی نجاست ہے جو انسان کے اندر سچی نیت، خلوص دل اور ایمان کی راہ میں رکاوٹ بنتی ہے۔

جبکہ اعمال کی پاکیزگی کا تذکرہ سورہ بقرہ میں اس انداز سے فرمایا:

وَ يَسْأَلُونَكَ عَنِ الْمَحِيضِ قُلْ هُوَ أَذًى فَاعْتَزِلُوا النِّسَاءَ فِي الْمَحِيضِ وَ لاَ تَقْرَبُوهُنَّ حَتَّى يَطْهُرْنَ فَإِذَا تَطَهَّرْنَ فَأْتُوهُنَّ مِنْ حَيْثُ أَمَرَكُمُ اللهُ إِنَّ اللهَ يُحِبُّ التَّوَّابِينَ وَ يُحِبُّ الْمُتَطَهِّرِينَ o (222:2)

ترجمہ: "لوگ آپ سے حیض کے بارے میں پوچھتے ہیں۔ کہہ دو کہ یہ ایک تکلیف دہ عمل ہے۔ پس عورتوں کو حیض میں اکیلا چھوڑ دو، ان کے قریب مت جاؤ یہاں تک کہ وہ پاک ہو جائیں جب وہ پاکیزہ ہو جائیں تو ویسی طرز پر ان کے قریب جاؤ جیسے اللہ نے آپ کو حکم دیا ہے۔ بے شک اللہ تعالی بہت زیادہ توبہ کرنے والوں اور پاکیزگی اختیار کرنے والوں کو پسند فرماتا ہے"۔

کیونکہ یہ پاکیزگی عمل سے مربوط ہے، اس لیے جس چیز کے ساتھ پاکیزگی کو جوڑ دیا گیا ہے وہ "توبہ" ہے۔ توبہ یعنی گناہوں سے، خطاؤں سے توبہ پچھتاوا، ندامت کے بعد اللہ کی بارگاہ میں واپس لوٹنا۔

ایک اور آیت جس میں عمل کی پاکیزگی کا تذکرہ ہے، حضرت لوطؑ سے مربوط ہے۔ حضرت لوطؑ نے اپنی بد کردار قوم کے لواط (یعنی مردوں کی مردوں سے بد فعلی) جیسے برے فعل پر نکتہ چینی اور تنقید کی تو کہنے لگے کہ لوط اور آپ کے ہمنواؤں کو بستی سے نکال دو، کیونکہ یہ لوگ پاکیزگی پسند ہیں۔ (إِنَّهُمْ أُنَاسٌ يَتَطَهَّرُونَ) (82:7)

عمل میں پاکیزگی لانے کے لئے اجتماعی سطح پر آداب اور اخلاقیات سیکھنے اور ان کا پاس رکھنے ضرورت ہے۔ اس کا ایک جلوہ عائلی زندگی ہے۔

عائلی زندگی میں جب تک پاکیزگی کا خیال نہ رکھا جائے، زندگی میں مثبت تبدیلی نہیں آ سکتی۔ پاکیزہ کردار رہنا خاندانی تربیت کا ایک اہم جزء ہے۔

اسی لیے تو فرمایا کہ "خبیث عورتیں، خبیث مردوں کے لئے، اور خبیث مرد خبیث عورتوں کے لیے ہیں، اور پاکیزہ عورتیں پاکیزہ مردوں کے لئے جبکہ پاکیزہ مرد پاکیزہ عورتوں کے لئے ہیں"۔(26:24)

حیات طیبہ کا بنیادی اصول ہے کہ یہ "طیبین اور طیبات" کے باہمی ملاپ سے تشکیل پاتی ہے۔ اس کے لیے درست کرداری بنیادی شرط ہے۔

جسم کو ظاہری نجاسات سے بچانا بھی اعمال کی پاکیزگی کا ایک رکن ہے۔ غسل پاکیزگی کی علامت ہے۔

اسلامی فقہ کے مطابق، انسان کے اندر کچھ چیزیں "حدث" جبکہ کچھ چیزیں "خبث" ہیں۔ حدث اندرونی نجاست، جبکہ

"خبث" بیرونی نجاست کو کہا جاتا ہے۔اندرونی نجاست انسان کی ذات سے نہیں بلکہ کچھ افعال (مثلاً نیند، پیشاپ یا پاخانہ نکلنے) سے پھوٹتی ہے۔پیشاب، پاخانہ اور خون جب جسم سے باہر نکلتا ہے تو یہ ظاہری نجاست کا موجب بھی بنتا ہے۔حدث کبھی چھوٹا ہوتا ہے تو کبھی بڑا۔چھوٹا حدث وضو کے ذریعے پاک ہو جاتا ہے، جبکہ بڑا حدث صرف غسل سے پاک ہوتا ہے۔فرمایا: "وَإِنْ كُنْتُمْ جُنُباً فَاطَّهَّرُوا" اگر جنب ہو جاؤ تو پاکیزگی اختیار کرو۔

پس اسلام میں غسل اور وضو کا تصور کسی گناہ سے نہیں جڑا۔یہ کسی خاص گناہ سے پاک ہونے کی علامت نہیں ہے، بلکہ انسان کی طبیعی "قذارتوں" سے جس سے خود انسان بھی اظہار بیزاری کرتا ہے، پاکیزگی دلانے کا ایک معقول طریقہ ہے۔

اللہ تعالی نے حضرت ابراہیمؑ اور اسماعیلؑ کے ہاتھوں بیت اللہ کی تعمیر کے بعد جو سب سے پہلا دستور دیا وہ یہی تھا کہ میرے گھر کو عبادت گزاروں کے لئے پاکیزہ اور صاف ستھرا رکھو۔یہ ظاہری پاکیزگی کی طرف اشارہ ہے۔

یہاں سے بھی ہم پاکیزگی کے قرآنی مفہوم کی وسعت کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔یہ پاکیزگی انفرادی ہی نہیں بلکہ اجتماعی بھی ہے، صرف ظاہری اور جسمانی نہیں بلکہ کردار کی پاکیزگی بھی ہے۔

"توبہ" اور اہل ایمان کا عملی ارتقاء

قرآن کے فکری منظومے میں جس طرح احسان کے ساتھ عدل کا مفہوم جڑا ہے۔اسی طرح "تطہیر" کے ساتھ توبہ کا مفہوم جڑا ہے۔گذشتہ سطور میں طہارت اور پاکیزگی کا مفہوم واضح ہو چکا ہے۔تاہم ایک نقطے کی وضاحت ضروری ہے کہ جن دو آیات میں اللہ تعالی نے "پاکیزگی پسند" لوگوں کے ساتھ محبت کا اظہار فرمایا ہے، ان میں سے ایک کا تعلق باطنی پاکیزگی سے تھا۔یعنی فکر، سوچ اور دل کی پاکیزگی، جس سے خالص ایمان پھوٹتا ہے۔دوسری آیت کا تعلق عمل کی پاکیزگی سے تھا جو خالص ایمان کا طبیعی نتیجہ ہے۔اب سوال یہ ہے کہ "توابیت" کو اللہ تعالی نے کون سے مقام پر رکھا ہے؟ یہ سمجھنا انتہائی اہم ہے۔اسی نکتے کا فہم "کلید حل مشکل" ہے۔

مطلوبہ آیت پر ایک نظر ڈالتے ہیں۔فرمایا:

فَإِذَا تَطَهَّرْنَ فَأْتُوهُنَّ مِنْ حَيْثُ أَمَرَكُمُ اللهُ إِنَّ اللهَ يُحِبُّ التَّوَّابِينَ وَيُحِبُّ الْمُتَطَهِّرِينَ (222:2)

ترجمہ: "جب تمہاری ازواج/بیویاں (حیض سے) پاک ہو جائیں تو ویسی طرز پر ان کے قریب جاؤ جیسے اللہ نے آپ کو حکم دیا ہے۔بے شک اللہ تعالی بہت زیادہ توبہ کرنے والوں اور پاکیزگی اختیار کرنے والوں کو پسند فرماتا ہے۔"

یہاں پر تائبین کے بجائے "توابین" کا لفظ استعمال ہوا ہے۔یہ مبالغے کا صیغہ ہے۔یوں کہا جا سکتا ہے کہ ہر عمل

میں بازبینی، اصلاح اور درستگی کی خواہش اور کوشش توابیت کہلاتی ہے۔

اب اس مسئلے پر ذرا غور فرمائیں کہ "توابیت" کا تعلق کس چیز سے ہے؟ ایمان کا مسئلہ ہے یا عمل کا؟

یقینا یہ ایمانیات کا مسئلہ نہیں ہے۔ بلکہ مسئلہ طرز عمل کا ہے۔ تنظیم زندگی کا مسئلہ ہے۔ ایک سچے مسلمان کی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنی زندگی کو اللہ تعالی کے احکام کی روشنی میں نظم و ضبط دے۔ اس نظم سے جب جی چراتا ہے، کتراتا ہے، اکتاتا ہے، منہ موڑتا ہے، عمل میں کوتاہی کرتا ہے تو اس کے لئے "توبہ" کی ضرورت پیش آتی ہے۔ یہ توبہ جب انسان کے اندر رچ بس جاتی ہے تو "توابیت" کی سطح پر پہنچ جاتی ہے۔ توبہ ممکن ہے ایک فعل ہو، جبکہ "توابیت" ایک "رویہ" ہے۔ "توابیت" مسلسل اصلاح کی کاوش ہے۔ اپنے اعمال کی اصلاح کے لئے جہد مسلسل ہے۔

توبہ در حقیقت بازگشت ہے۔ اسی نکتہ کی طرف جہاں سے ایک مسلمان کا عمل انحراف کا شکار ہوتا ہے۔ قرآن کریم کی نوے فیصد آیات میں توبہ کو عملی زندگی کی تنظیم کے لئے رکھا گیا ہے۔ قرآنی آیات پر سرسری نگاہ ڈالنے سے نتیجہ ملتا ہے کہ بنیادی ترین امور جن سے توبہ کی ضرورت پیش آتی ہے "ظلم"، "سیئات" (برائیاں)، "ذنب" (گناہ)، "فاحشہ" (حد سے تجاوز)[20] اور خطائیں ہیں۔ چنانچہ ارشاد ہوا:

فَتَلَقَّى آدَمُ مِنْ رَبِّهِ كَلِماتٍ فَتابَ عَلَيْهِ إِنَّهُ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيمُ (37:2)

ترجمہ: "حضرت آدمؑ نے اپنے رب سے کچھ کلمات دریافت کیے اور (رب کے حضور توبہ کی) تو اللہ تعالی نے توبہ قبول کر لی، بیشک وہ تواب و رحیم ہے۔"

یہ اس درخت کا پھل کھانے کے بعد کی توبہ کا تذکرہ ہے۔ اس کا تعلق حضرت آدم کے عمل سے ہے۔ جسے قرآن نے ظلم سے تعبیر کیا ہے۔ (فَتَكُونَا مِنَ الظَّالِمِينَ)۔ (35:2)

دوسری آیت ملاحظہ ہو:

أُحِلَّ لَكُمْ لَيْلَةَ الصِّيامِ الرَّفَثُ إِلى نِسائِكُمْ هُنَّ لِباسٌ لَكُمْ وَ أَنْتُمْ لِباسٌ لَهُنَّ عَلِمَ اللهُ أَنَّكُمْ كُنْتُمْ تَخْتانُونَ أَنْفُسَكُمْ فَتابَ عَلَيْكُمْ وَ عَفا عَنْكُمْ فَالْآنَ بَاشِرُوهُنَّ وَ ابْتَغُوا ما كَتَبَ اللهُ لَكُمْ (187:2)

ترجمہ: "تمہارے لیے روزوں کے ایام میں رات کے وقت اپنی خواتین سے نزدیکی کو جائز قرار دیا گیا ہے۔ یہ خواتین تمہارے لیے لباس ہیں جبکہ تم ان کے لئے لباس ہو۔ بیشک اللہ تعالی جانتا ہے کہ تم اپنے آپ سے خیانت کیا کرتے تھے، لیکن اللہ نے تمہاری توبہ قبول کر لی اور تمہیں معاف کر دیا۔ پس اب تم نزدیکی کر سکتے ہو اور اللہ کے قوانین کا پاس رکھو۔"

اس آیت میں بھی توبہ کا تذکرہ انسان کی عملی زندگی کے ساتھ جوڑ دیا ہے۔

فَإِنْ لَمْ تَفْعَلُوا فَأْذَنُوا بِحَرْبٍ مِنَ اللهِ وَ رَسُولِهِ وَإِنْ تُبْتُمْ فَلَكُمْ رُؤُسُ أَمْوالِكُمْ لا تَظْلِمُونَ وَ لا تُظْلَمُونَ (279:2)

ترجمہ: "اگر تم نے ایسا نہ کیا (یعنی سود خوری سے باز نہ آئے) تو اللہ اور رسول کے ساتھ جنگ کے لئے تیار ہو جاؤ۔ اور اگر تم توبہ کر لو تو تمہارے لیے اپنے اصل مال واپس لینے کا حق محفوظ ہے۔ نہ کسی پر ظلم کرو اور نہ ہی تم پر کوئی ظلم کرے۔"

اس آیت میں سود خوری سے توبہ کرنے کا تذکرہ ہے۔ یہ بھی ایک عملی انحراف ہے جو اجتماعی اور معاشی زندگی کو متأثر کرتا ہے۔ فرمایا:

وَ الَّذانِ يَأْتِيانِها مِنْكُمْ فَآذُوهُما فَإِنْ تابا وَ أَصْلَحا فَأَعْرِضُوا عَنْهُما إِنَّ اللهَ كانَ تَوَّاباً رَحِيماً (16:4)

ترجمہ: "تم لوگوں میں سے اگر دو مرد برائی انجام دیں، تو انہیں سزا دو، اگر توبہ کر لیں اور اپنی اصلاح کر لیں تو ان سے درگذر کر دو، بیشک اللہ تعالی توبہ قبول کرنے والا نہایت مہربان ہے۔"

اس آیت میں بھی ایک عملی انحراف سے توبہ کا ذکر ہے۔ اسی طرح ارشاد ہوا:

إِنَّمَا التَّوْبَةُ عَلَى اللهِ لِلَّذِينَ يَعْمَلُونَ السُّوءَ بِجَهالَةٍ ثُمَّ يَتُوبُونَ مِنْ قَرِيبٍ فَأُولٰئِكَ يَتُوبُ اللهُ عَلَيْهِمْ وَ كانَ اللهُ عَلِيماً حَكِيماً (17:4)

ترجمہ: "بیشک اللہ پر بخشش کا معاملہ بنتا ہے ان لوگوں کے لئے جو نادانی میں برائی انجام دیتے ہیں، پھر جلد ہی توبہ کر لیتے ہیں تو ایسے لوگوں کی توبہ اللہ تعالی قبول کر لیتا ہے۔ اور اللہ تعالی علم و حکمت والی ذات ہے۔"

اگلی ہی آیت میں فرمایا:

وَ لَيْسَتِ التَّوْبَةُ لِلَّذِينَ يَعْمَلُونَ السَّيِّئاتِ حَتَّى إِذا حَضَرَ أَحَدَهُمُ الْمَوْتُ قالَ إِنِّي تُبْتُ الْآنَ وَ لَا الَّذِينَ يَمُوتُونَ وَ هُمْ كُفَّارٌ أُولٰئِكَ أَعْتَدْنا لَهُمْ عَذاباً أَلِيماً (18:4)

ترجمہ: "ان لوگوں کے لئے توبہ نہیں ہے، جو برائیاں کرتے رہتے ہیں، (زندگی برائیوں میں کٹ جاتی ہے) پھر جب موت سر پر آن کھڑی ہوتی ہے تو کہتے ہیں: یا اللہ اب توبہ کرتا ہوں۔ اسی طرح کفر پر مرنے والوں کی بھی کوئی توبہ نہیں ہے۔ ایسے لوگوں کے لئے ہم نے دردناک عذاب تیار کر رکھا ہے۔"

پچھلی آیت میں "سوء" کا تذکرہ ہے، اور جبکہ اس آیت میں "سیئات" کا تذکرہ ہے۔ سیئۃ کا لفظ قرآن کریم میں متعدد بار استعمال ہوا ہے۔ منجملہ:

مَنْ كَسَبَ سَيِّئَةً... جس نے برائی کمائی۔، وَ مَنْ جاءَ بِالسَّيِّئَةِ... جو برائی لے کر (روز محشر) حاضر ہوا۔، مَنْ عَمِلَ سَيِّئَةً... جس نے برا عمل کیا۔، وَ جَزٰاءُ سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِثْلُها ...برائی کا بدلہ برائی ہی ہے۔، شَفٰاعَةً سَيِّئَةً ...بری سفارش۔، وَ إِنْ تُصِبْهُمْ سَيِّئَةٌ ...اگر انہیں کوئی برائی (مصیبت) چمٹتی ہے۔، يَعْمَلُونَ السَّيِّئٰاتِ وہ لوگ برے اعمال کرتے ہیں ...، فَأَصٰابَهُمْ سَيِّئٰاتُ ما عَمِلُوا ...انہیں اپنے

اعمال کے ناپسندیدہ نتائج کا سامنا کرنا پڑا۔ نُكَفِّرْ عَنْكُمْ سَيِّئٰتِكُمْ ...ہم تمہاری خطاؤں سے درگذر کردیں گے۔ اجْتَرَحُوا السَّيِّئٰتِ...انہوں نے خطائیں کیں۔

ان میں سے اکثر آیات کا تعلق اعمال سے ہے، جب کچھ آیات میں بلاؤں اور مصیبتوں کو بھی سیئات کہا گیا ہے۔ سوء لغوی اعتبار سے : "الاسْمُ الجامِعُ للآفاتِ و الداءِ"[21]، یعنی ہر آفت اور مرض کو سوء کہا گیا ہے۔ "سیئات" "حسنات" کے مقابلے میں آتا ہے۔ بقول آقا مصطفوی کے، سوء کا اطلاق ہر اس چیز پر ہوتا ہے جو ذاتی طور پر مستحسن نہ ہو، چاہے یہ عمل میں ہو یا موضوع میں یا حکم میں، قلبی امر ہو یا معنوی یا دیگر۔ قباحت میں صرف ظاہری شکل و صورت کا خیال رکھا جاتا ہے، جبکہ سوء ہر ایک کو شامل ہے۔[22] پس تمام وہ اعمال و افعال اور موضوعات سیئات کہلائیں گے، جو انسان کی نفسیاتی اور روحانی تندرستی کے لئے مناسب نہیں ہوتے۔

ان سب آیات سے نتیجہ ملتا ہے کہ توبہ عملی اصلاح کی جانب ایک اہم قدم ہے۔ جب تک کوئی اپنے افعال کو مستحسن شمار کرتا رہتا ہے، ان پر راضی رہتا ہے، وہ توبہ نہیں کرتا۔ لہٰذا توبہ کے لئے سب سے پہلی چیز اپنے نکتہ ضعف کا ادراک ہے۔ اپنی بازبینی، اور اصلاح مسلسل کا یہ رویہ اللہ تعالی کو بیشک پسند ہے۔ (ان اللہ یحب التوابین)۔

کیا توبہ صرف انفرادی مسئلہ ہے؟

بظاہر انسان سوچتا یہی ہے کہ اللہ تعالی کی طرف رجوع ایک انفرادی مسئلہ ہے۔ لہٰذا توبہ اور استغفار کا تعلق ہر انسان کی اپنی ذات سے ہے۔ ویسے بھی اب توبہ اور استغفار ایک عبادت میں تبدیل ہو چکا ہے۔ اور عبادات مراقبے اور ذاتی توجہ کے ذریعے انجام پاتی ہیں۔ لیکن جب ہم قرآن کریم کی طرف رجوع کرتے ہیں تو وہاں انفرادی توبہ کے ساتھ اجتماعی توبہ کو الگ سے توجہ دی گئی ہے۔ انفرادی طور پر حضرت آدمؑ و حواؑ کی توبہ (37:2)، چنانچہ شجرہ ممنوعہ سے پھل توڑ کر کھانا حضرت آدمؑ و حواؑ کا ذاتی فعل تھا، اور ان کی توبہ بھی خود انہی کی طرف منسوب کی گئی۔ یہ انفرادی مسئلہ ہے۔ اسی طرح حضرت ذوالنونؑ کی توبہ جنہوں نے "لا الہ الا انت سبحانك" پڑھ کر اپنی کوتاہی کا اعتراف کیا۔ اسی طرح اہل ایمان کی توبہ کا تذکرہ بھی ان کے انفرادی خطاؤں کے متعلق بعض آیات میں ملتا ہے، چنانچہ ارشاد ہوا:

وَإِذا جاءَكَ الَّذينَ يُؤْمِنُونَ بِآياتِنا فَقُلْ سَلامٌ عَلَيْكُمْ كَتَبَ رَبُّكُمْ عَلى نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ أَنَّهُ مَنْ عَمِلَ مِنْكُمْ سُوءاً بِجَهالَةٍ ثُمَّ تابَ مِنْ بَعْدِهِ وَ أَصْلَحَ فَأَنَّهُ غَفُورٌ رَحيمٌ (54:6)

ترجمہ: "جب تمہارے پاس مؤمن لوگ آئیں تو انہیں کہو کہ تم پر سلامتی ہو، رب تعالی نے خود پر رحمت کو مقرر فرمادیا ہے، بیشک تم میں سے جو بھی نادانی کی وجہ سے برائی کا ارتکاب کرے پھر توبہ تائب ہو

جائے اور اصلاح کر لے تو وہ غفور ور حیم ہے۔"

یہاں پر بھی انفرادی اصلاح کا ذکر ہے اور انفرادی توبہ کے نتیجہ میں عفو و بخشش کی نوید سنائی گئی ہے۔ اسی طرح فرمایا:

وَ الَّذانِ یَأْتِیانِها مِنْکُمْ فَآذُوهُما فَإِنْ تابا وَ أَصْلَحا فَأَعْرِضُوا عَنْهُما إِنَّ اللهَ کانَ تَوَّاباً رَحِیماً (16:4)

ترجمہ: "تم لوگوں میں سے اگر دو مرد برائی انجام دیں، تو انہیں سزا دو، اگر توبہ کر لیں اور اپنی اصلاح کر لیں تو ان سے در گذر کر دو، بیشک اللہ تعالی توبہ قبول کرنے والا نہایت مہربان ہے۔"

یہ دو آدمیوں کا ذاتی فعل ہے اور اس کی سزا اور اس کے بعد توبہ کا تعلق بھی انہی دو سے ہی ہے۔ اسی طرح فرمایا:

إِنْ تَتُوبا إِلَی اللهِ فَقَدْ صَغَتْ قُلُوبُکُما وَ إِنْ تَظاهَرا عَلَیْهِ فَإِنَّ اللهَ هُوَ مَوْلاهُ وَ جِبْرِیلُ وَ صالِحُ الْمُؤْمِنِینَ وَ الْمَلائِکَةُ بَعْدَ ذلِکَ ظَهِیرٌ (4:66)

ترجمہ: "اگر تم دونوں (خواتین) توبہ کر لو تو (یہ بہت ضروری ہے کیونکہ) تمہارے دل ٹیڑھے ہو چکے ہیں، اور گر تم دونوں نے پیغمبر (ص) کے خلاف گٹھ جوڑ کر لیا تو بیشک اللہ اس کا مولی ہے، جبریل، نیک مؤمنین اور ملائکہ پھر اگلے درجے میں اس کے مددگار ہیں۔"

یہ بھی دو خواتین کا ذاتی فعل تھا، جس پر انفرادی توبہ کی دعوت قرآن کریم نے دی ہے۔ اسی طرح تین آدمیوں کے متعلق فرمایا:

وَ عَلَی الثَّلاثَةِ الَّذِینَ خُلِّفُوا حَتَّی إِذا ضاقَتْ عَلَیْهِمُ الْأَرْضُ بِما رَحُبَتْ وَ ضاقَتْ عَلَیْهِمْ أَنْفُسُهُمْ وَ ظَنُّوا أَنْ لا مَلْجَأَ مِنَ اللهِ إِلاَّ إِلَیْهِ ثُمَّ تابَ عَلَیْهِمْ لِیَتُوبُوا إِنَّ اللهَ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِیمُ (118:9)

ترجمہ: "ان تین لوگوں پر جو (جہاد سے) پیچھے رہ گئے، یہاں تک کہ زمین ان پر تمام تر وسعتوں کے باوجود تنگ ہو گئی اور خود انہیں جان کے لالے پڑ گئے، اب انہیں یقین ہو گیا کہ سوائے اللہ تعالی کے کوئی دوسری پناہ گاہ نہیں ہے، پھر اللہ تعالی نے ان کی سن لی، اور ان کی توبہ قبول ہو گئی، بے شک اللہ تعالی توبہ قبول کرنے والا نہایت مہربان ہے۔"

یہ ایک دو یا تین آدمیوں کے افعال سے متعلق آیات کے کچھ نمونے تھے۔ جہاں ذاتی فعل پر توبہ کی دعوت دی گئی۔ لیکن جب کوئی فعل سماجی رویہ بن جائے۔ سماج کی نس نس میں دوڑنے لگ جائے تو پھر ایک آدھ آدمی کی توبہ سے کام نہیں چلتا۔ عقل یہی کہتی ہے کہ اس پورے سماج میں اس فعل کے متعلق ندامت و پشیمانی اور پھر بازبینی اور اصلاح کی ضرورت پیش آئے گی۔ تب جا کر مسئلہ حل ہو گا۔ قرآنی خطابات بھی اسی کی تائید کرتے ہیں۔ چنانچہ حضرت موسی (ع) کی قوم کے متعلق فرمایا:

وَ إِذْ قالَ مُوسی لِقَوْمِهِ یا قَوْمِ إِنَّکُمْ ظَلَمْتُمْ أَنْفُسَکُمْ بِاتِّخاذِکُمُ الْعِجْلَ فَتُوبُوا إِلی بارِئِکُمْ فَاقْتُلُوا أَنْفُسَکُمْ ذلِکُمْ خَیْرٌ

لَكُمْ عِنْدَ بارِئِكُمْ فَتابَ عَلَيْكُمْ إِنَّهُ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيمُ (54:2)

ترجمہ: "اور جب حضرت موسیٰ نے اپنی قوم سے فرمایا کہ اے میری قوم تم نے بچھڑے کو اپنا معبود بنا کر اپنے آپ پر ظلم کیا ہے تو اب اپنے پروردگار کی طرف لوٹ آؤ، اپنے نفسوں کو مار دو، یہی تمہارے لیے بہتر ہے، پس وہ تمہاری توبہ قبول کرلے گا، بیشک وہ تواب ورحیم ہے۔"

یہاں خطاب فرد سے نہیں ہے، بلکہ قوم سے ہے۔ کیونکہ مسئلہ ایک دوآدمیوں کا نہیں تھا۔ حضرت ہارونؑ نے بھی قوم کا حال بتلایا تو فرمایا کہ "ان القوم استضعفونی" یعنی پوری قوم نے مجھے کمزور قرار دیا اور نزدیک تھا کہ مجھے جان سے مار ڈالتے۔ لہٰذا مسئلہ اجتماعی نوعیت کا تھا تو مذکورہ بالا آیت میں توبہ کا دستور بھی پوری قوم کے لئے صادر ہوا۔ اسی طرح فرمایا:

وَ يا قَوْمِ اسْتَغْفِرُوا رَبَّكُمْ ثُمَّ تُوبُوا إِلَيْهِ يُرْسِلِ السَّماءَ عَلَيْكُمْ مِدْراراً وَ يَزِدْكُمْ قُوَّةً إِلى قُوَّتِكُمْ وَ لا تَتَوَلَّوْا مُجْرِمِينَ (52:11)

ترجمہ: "اے میری قوم اللہ تعالی سے معافی مانگو، پھر اس کی طرف لوٹ آؤ تو وہ تم پر آسمان کی برکات فراوانی سے بھیجے گا اور تمہاری طاقت میں مزید اضافہ کردے گا اور اللہ سے کٹ کر منہ دوسری طرف نہ موڑو۔"

یہ دعوت حضرت ہودؑ کی طرف سے اپنی قوم کے لئے تھی، اسی سے ملتی جلتی دعوت حضرت نوحؑ نے بھی اپنی قوم کو دی۔ دونوں ہی بے نتیجہ رہیں اور آخر میں ان دونوں قوموں پر اللہ تعالی کی افتاد آن پڑی۔

امت محمد (ص) کو بھی حکم ملا کہ سود خوری سے اجتماعی طور پر پرہیز کریں۔ یہ انفرادی مسئلہ نہ تھا۔ فرمایا

فَإِنْ لَمْ تَفْعَلُوا فَأْذَنُوا بِحَرْبٍ مِنَ اللهِ وَ رَسُولِهِ وَإِنْ تُبْتُمْ فَلَكُمْ رُؤُسُ أَمْوالِكُمْ لا تَظْلِمُونَ وَ لا تُظْلَمُونَ (279:2)

ترجمہ: "اگر تم نے ایسا نہ کیا (یعنی سود خوری سے باز نہ آئے) تو اللہ اور رسول کے ساتھ جنگ کے لئے تیار ہو جاؤ۔ اور اگر تم توبہ کرلو تو تمہارے لیے اپنے اصل مال واپس لینے کا حق محفوظ ہے۔ نہ کسی پر ظلم کرو اور نہ ہی تم پر کوئی ظلم کرے۔"

سود خوری اور معیشتی ظلم سے توبہ کرنے کا مسئلہ انفرادی اس لیے نہیں ہے کیونکہ معیشت خود انفرادی مسئلہ نہیں ہے۔ معیشت کے رگ و پے میں جب سود خوری اور ظلم و ستم دوڑا دیا جاتا ہے تو پھر کمزور آدمی کا جینا دوبھر ہو جاتا ہے۔ سرمایہ دار طبقہ اپنے سرمائے کے بل بوتے پر کمزور طبقات کا معاشی استحصال کرتا ہے۔ ایسا معاشرہ پھر فلاح و نجات کیسے پا سکتا ہے؟

لہٰذا قرآن نے جب فرمایا ہے کہ "مؤمنین" بیشک فلاح یافتہ ہیں تو یقینا ان کی فلاح و بہبود کا طریقہ کار بھی

تو اللہ تعالی نے دیا ہے۔ بغیر اس کے ایسی بات کرنا کوئی معنی نہیں رکھتا۔ معیشت اس فلاح و بہبود کا ایک بنیادی جزء ہے۔اور اس کے لئے " لاتَظْلِمُونَ وَلاتُظْلَمُونَ " کا انتہائی جامع و مانع اصول قرآن کریم نے دیا ہے۔ اصل مسئلہ اسے فہم کرنے اور اس پر عمل درآمد کرنے کا ہے۔ کیونکہ اس کا انحصار زمان و مکان کے تقاضوں پر ہے۔ جس کے لیے اجتہادی کاوشوں سے اسلامی نقطہ نظر سے معاشی نظام وضع کرنے کی ضرورت ہے، بغیر اس کے فلاح و بہبود ناممکن ہے۔

نتیجہ

قرآنی نقطہ نظر سے تقوا انسان کی انفرادی زندگی کی طرح مسلم سماج کی اجتماعی زندگی پر بھی محیط ہے۔ متقین قرآنی مفہوم کی گہرائی اور وسعت کی روشنی میں بابصیرت انسانوں کا وہ مجموعہ ہیں جو باہمی تعاون واشتراک عمل، صبر و استقامت، معاشی امور کی اصلاح اور مستحکم زبانی روابط کی بنیاد پر سماج میں حیات طیبہ تشکیل دیتے ہیں۔ تقوا انسان کو بابصیرت بنا کر زندگی کو لاحق مادی و معنوی خطرات سے محفوظ رہنا سکھاتا ہے۔ متقی لوگ ہی درحقیقت طہارت اور پاکیزگی کے علمبردار ہوتے ہیں۔ پاکیزگی پسندی انہیں جہاں ظاہری طور پر ماحول پاکیزہ رکھنے کی تلقین کرتی ہے، وہیں ایمان کی پاکیزگی اور منافقانہ رویوں سے پرہیز کا سبق بھی دیتی ہے۔ توابیت ان صفات کے حامل لوگوں کا رویہ ہے، جن کے بغیر طہارت اور تقوا کا خواب ادھورا رہ جاتا ہے۔ یہ صفت تکمیلی کردار ادا کرتی ہے۔ یعنی مذکورہ صفات کا حامل طبقہ اپنی غلطیوں پر اصرار کرنے کے بجائے، ہمیشہ اصلاح اور بہتری کے لیے فکرمند رہتا ہے۔ یوں قرآن کے فکری منظومے میں تقوا، طہارت اور توابیت وہ جامع اخلاقی صفات ہیں، جن کے بل بوتے پر مسلم سماج میں حیات طیبہ کی تشکیل ممکن ہوتی دکھائی دیتی ہے۔۔

*****

References

1. Muhammad Furqan Gohar, "The Impact of Almighty Allah's Love & Non-Love upon the Moral Upbringing of A Muslim Society", Quarterly Noor-e-Marafat, Volume 14, Issue 59, (2023): 9.

محمد فرقان گوہر، "مسلم سماج کے اخلاقی ارتقاء میں اللہ تعالی کی پسند و ناپسند کی تأثیر"، سہ ماہی نور معرفت، جلد 14، شمارہ **59**، (2023): **9**۔

2. Hussain bin Muhammad Raghib, Isfahani, *Muafradat 'alfaz al-Qur'an*,

Vol. 1(Lebanon, Syria I, Dar-ul-Ilam - Al-Dar al-Shamiat, 1412 AH), 881.

حسین بن محمد راغب، اصفہانی، *مفردات الفاظ القرآن*، ج**1** (لبنان، سوریہ اول، دار العلم - الدار الشامیۃ، 1412 ھ ق)، **881**۔

3. Syed Muhammad Razi, *Nahj al-Balaghah* (Qum, Mas'isah Nahj al-Balaghah, 1414 AH), Sermon 184.

سید محمد رضی، *نہج البلاغۃ* (قم، مؤسسہ نہج البلاغہ، 1414 ھ ق)، خطبہ 184۔

4. Ibid.

ایضاً۔

5. Isfahani, *Muafradat 'alfaz al-Qur'an*, 625.

اصفہانی، *مفردات الفاظ القرآن*، 625۔

6. Hassan, Mustafawi, *Al-Tehqeeq fi Kalamat al-Qur'an al-Karim*, Vol. 9 (Tehran, Markz al-Kitab Lil-Tarajmat wa al-Nisher, 1402 AH), 33.

حسن، مصطفوی، *التحقیق فی کلمات القرآن الکریم*، ج 9 (تہران، مرکز الکتاب للترجمۃ والنشر، 1402 ھ ق)، 33۔

7. Isfahani, *Muafradat 'alfaz al-Qur'an*, 192.

اصفہانی، *مفردات الفاظ القرآن*، **192**۔

8. Mustafawi, *Al-Tehqeeq fi Kalamat al-Qur'an al-Karim*, Vol. 2, 75.

مصطفوی، *التحقیق فی کلمات القرآن الکریم*، ج **2**، 75۔

9. Safoora Razzak pour Razai wa Jamshed Jalali Shebani wa Muzhgan Sarshar, "The study of the application of two-faced sin and repentance in the Holy Qur'an and the Gospel", Research in the Holy Qur'an, Issue 108, (2023); link:

https://jqr.isca.ac.ir/article_75053.html (Accessed April, 26, 2024).

ملاحظہ فرمائیں فارسی مقالہ: صفورا رزاق پور رضایی و جمشید جلالی شیبانی و مژگان سرشار، "مطالعہ تطبیقی انگارہ ہای دوو جہی گناہ و توبہ در قرآن کریم و انجیل"، پژوہش ہای قرآنی، شمارہ 108، (2023)۔

10. Ibn Jarir, al-Tabari, *Jami al-Bayan*, Vol. 11, (Beirut., Dar-ul Fiker, 1412 AH), 20-23.

ابن جریر طبری، *جامع البیان فی تفسیر القرآن*، ج 11، (بیروت، دار المعرفۃ، 1412ھ.ق)، 20-23۔

11. Ibid.

ایضاً۔

12. Ibid.

ایضاً۔

13. Muhammad bin Yaqoub Abu jafar, kulani, *al-Kafi*, Vol. 3, (Tehran, Dar al-Kutub al-Islamiyahat, 1407 AH), 296.

محمد بن یعقوب ابو جعفر، کلینی، *الکافی*، ج3، (تہران، دار الکتب الاسلامیۃ، 1407ھ ق)، 296۔

14. Mehmod bn Umar, Zamakhshri, *Al-Kashf aen Ghuwamaz al-Tanzehl wa Ahyon al-Aqwahil fi Wajoh al-Tahwail*, Vol. 2, Edited by Hussain Ahmad, Mustafa, Chap. III, (Beirut, Dar al-Kitab al-Arabi, 1407 AH). 311; Muhammad Hussain, Tabatabai, *Al-Mizan fi Tafsir al-Qur'an*, Vol. 9, (Beirut, Muasasat al'Elami lilmatbuat, 1390 SH), 390.

محمود بن عمر، زمخشری، *الکشاف عن حقائق غوامض التنزیل وعیون الاقاویل فی وجوہ التأویل*، ج2، مصحح: حسین احمد، مصطفیٰ، طبع سوم، (بیروت، دار الکتاب العربی، 1407ہ.ق) 311؛ محمد حسین، طباطبایی، *المیزان فی تفسیر القرآن*، ج9، (بیروت، مؤسسۃ الاعلمی للمطبوعات، 1390 ھ ق)، 390۔

15. Allama Syed Mehmood, Alusi, *Rooh al-Ma'ani*, Vol. 6, (Beirut, Dar al-Fikr, 1417 AH), 20.

علامہ سید محمود، آلوسی، *روح المعانی*، ج6، (بیروت، مطبوعہ دار الفکر، 1417ھ)، 20۔

16. Ibn Hanbal Shaybani, Ahmad, *Musnad Ahmad bn Hanbal*, Vol. 24, Research: Shuaib Al-Arnawat wa Adil Murshid wa Degran, chap. I, (Massida Al-Risala, 1421 AH), 235.

ابن حنبل شیبانی، احمد، *مسند احمد بن حنبل*، ج24، تحقیق: شعیب الأرنؤوط وعادل مرشد ودیگران، طبع اوّل، (مؤسسۃ الرسالۃ، 1421ق)، 235۔

17. kulani, *al-Kafi*, Vol. 1, 354.

کلینی، *الکافی*، ج1، 354۔

18. Abu Ali Fazal bn Hassan, Tabarsi, *Muqadma Majmah al-Bayan*, Vol. 5, (Beirut, Darahiya al-Trath al-Arabi,1372 AH), 110.

ابو علی فضل بن حسن، طبرسی، *مقدمہ مجمع البیان*، ج5، (بیروت، دار احیاء التراث العربی، 1372ق.)، 110۔

19. Ibn Majah, Imam Muhammad Ibn Yazid, Vol.1, *Sunan Ibn Majah*, Vol.1, Annotator Maroof, Bashhar Awad, (Riaz, Dar-es-Salaam, nd.), 309.

ابن ماجہ، امام محمد بن یزید، *سنن ابن ماجہ*، ج1، تحقیق: معروف، بشار عواد، (بیروت، دار الجیل، 1418ہ.ق)، 309۔

20. Ismail bn Hammad Johary, *Taj Al-Laghga wa Sahih al-Arabiya*, Vol. 3, Editor/Corrector: Ahmad Abd al-Ghafoor Attar, Chap. 1, (Beirut, Darul Alam for the Millions, 1410 AH). 1014.

اسماعیل بن حماد جوہری، *تاج اللغۃ وصحاح العربیۃ*، ج3 محقق/ مصحح: احمد عبد الغفور عطار، چاپ اول، (بیروت، دار العلم للملایین، 1410ق.) 1014۔

21. Ismail al-Sahib bn Ibad, *Al-Mahed fi al-Laghgaat*, Vol. 8, Research: Muhammad Hassan al-Yaseen, Chap. I, (Beirut, Alam al-Kitab, 1414 AH), 415.

اسماعیل الصاحب بن عباد، المحیط فی اللغۃ، ج 8، تحقیق: محمد حسن آل یاسین،، طبع اول، (بیروت، عالم الکتب، 1414ھ.ق) 415۔

22. Mustafawi, *Al-Tehqeeq fi Kalamat al-Qur'an al-Karim*, Vol. 5, 251.

مصطفوی، التحقیق فی کلمات القرآن الکریم، ج 5، 251۔